شاہراہِ مکّہ

(۲)

(عید الحمید)

جناب اسد صاحب غم وافسوس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اہلِ مغرب کی اسلامی تہذیب وتمدن پر دست درازی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انھوں نے مغربی استعمار کے ان ناپاک ارادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"ہزاروں غیر ملکی قوتیں ——سیاسی، معاشرتی اور معاشی—— اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں۔ ان حالات میں ہمارے لیے سوچنے کی بات یہی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ کیا مسلم اقوام ان کے سامنے سرنگوں ہوجائیں گی اور اس طرح نہ صرف اپنی روایات کو تباہ کریں گی بلکہ اپنی روحانی بنیادوں کو بھی خود اپنے ہاتھوں سے مسمار کردیں گی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک چار سال جو میں نے مشرقِ وسطیٰ میں گزارے ان میں مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کس طرح اہلِ یورپ مسلمانوں کے تمدن اور ان کی ہیئتِ اجتماعیہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں، اور جب کبھی مسلمان اس کے خلاف کوئی آواز اٹھاتے ہیں یا جدوجہد کرتے ہیں تو یہ لوگ نہایت ہی حقارت سے، مسلمانوں کی ان مساعی کو، جو درا صل اُن کے احساس کا ایک قدرتی تقاضا ہے، اجانب بیزاری (XENOPHOBIA) سے تعبیر کرتے ہوئے اسے یکسر نظرانداز کردیتے ہیں۔"

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ غیر ملکی آقا اپنے اس ظالمانہ رویہ پر نادم ہونے کی بجائے اس پر بڑا فخر محسوس کرتے ہیں اور مسلمانوں پر اپنا یہ احسانِ عظیم جتلاتے ہیں کہ وہ ان "جاہل" اور "پسماندہ" لوگوں کو تہذیب وشائستگی سے سرفراز فرمارہے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر جب کبھی احساسِ آزادی

نے کروٹ لی۔ اسے ان "محسنین" نے مسلم قوم کی روایتی احسان فراموشی اور ناشکری سمجھا اور فوراً قوت کے ذریعے اُسے "راہ راست" پر لانے کی کوشش کی۔ یورپ نے "اصلاح" کی ساری کوششیں صرف مسلمانوں ہی پر صرف کرنی پسند کیں اور اپنے گھر کو قریب قریب اس سے محروم رکھا۔ پچھلے چند سالوں کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب بھی دنیائے مغرب کی کسی قوم نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تو سوائے اس ایک قوم کے جس کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے وہ کوشاں تھی، باقی سب قوموں نے اُس کی تائید کی۔ مثال کے طور پر جب آئرلینڈ والوں نے جنگ آزادی لڑی تو سوائے انگریزوں کے باقی سب لوگوں نے اُن کی کوشش کو سراہا۔ اسی طرح جب پولینڈ نے آزادی کا علم بلند کیا تو روس اور جرمنی کو چھوڑ کر سب نے اس کی دل و جان سے معاونت کی۔ مگر مسلمانوں کے معاملہ میں یورپ کا رویہ بالکل مختلف رہا ہے۔ ان بیچاروں کے اندر جب کبھی یہ احساس پیدا ہوا تو سب نے متحد ہو کر اُن کے اس احساس کو بجبر دبانے کی کوشش کی۔ اور اپنے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ فعل کو برحق ثابت کرنے کے لیے یہ احمقانہ بات کہی گئی کہ چونکہ مسلم ممالک سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط نہیں اس لیے ان کے معاملات میں مغربی اقوام کی دخل اندازی نہ صرف بالکل جائز اور درست ہے بلکہ مسلم قوم کے لیے بھی بے حد مفید ہے۔ اس قسم کی لغو منطق پر بحث کرتے ہوئے اسد صاحب فرماتے ہیں:-

"اس طرز خیال کے حاملین غالباً اس بڑی حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ جب باہر سے کوئی چیز کسی کسی قوم پر بجبر مسلط کی جائے، خواہ وہ اچھی ہی کیوں نہ ہو تو اس سے قوم کا ارتقا رک جاتا ہے۔ یہ لوگ صرف ریلوں کے اُس جال کو دیکھتے ہیں جو کہ استعماری طاقتوں نے ان "شکارگاہوں" میں پھیلا رکھا ہے لیکن وہ اُس عظیم نقصان پر غور نہیں کرتے جو ان ظالم اقوام نے کمزوروں کی تہذیب و معاشرت کو پہنچایا ہے۔ اگر آسٹریا مہذب بنانے کے "پاک ارادے" سے بلقان کے معاملات میں دخل دے تو اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا لیکن اگر یہی حرکت انگریز مصر میں، روس وسطی ایشیا میں، فرانس مراکو، اور اٹلی لیبیا میں کرے تو اس کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسے ان اقوام پر ایک ایسا احسان سمجھا جاتا ہے جس کے بار سے یہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتیں۔ ان کے ذہن

میں ایک ثانیہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ بہت سی وہ معاشی اور سماجی برائیاں جن کو بہانہ بنا کر مسلم اقوام کو محکوم بنایا گیا ہے وہ تو خود مغربی استیلا کا نتیجہ ہیں اور یہ مغرب کی استعماری طاقتیں اس لیے ان کے معاملات میں دخل دیتی ہیں تاکہ کسی طرح ان کے اندر خلفشار پیدا کیا جائے اور پھر اسے برقرار رکھا جائے اور یہ بے بس قومیں خود اپنے پاؤں پر کبھی بھی کھڑے ہونے کے قابل نہ ہو سکیں"

اسد صاحب کو مغربی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور مسلم ممالک کی مظلومیت کا صحیح احساس ۱۹۲۲ء میں ہوا جب وہ فلسطین میں سیر و سیاحت کے بعد مصر تشریف لے گئے۔ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے اُن روح فرسا مناظر کو دیکھا کہ کس طرح انگریزی فوج نہتے مصریوں پر پہلے تو ستم گراتی اور جب لوگوں میں کچھ بھی اضطراب پیدا ہوتا، جو اس قسم کے ظلم و ستم کا قدرتی نتیجہ ہے، تو فوراً "خوئے بد را بہانہ بسیار" کے مصداق امن و امان قائم کرنے کے بہانے لوگوں پر نہایت خوفناک قسم کا تشدد ڈھایا جاتا۔ لوگوں نے شاعری میں تو بلاشبہ یہ پڑھا تھا ؎

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

لیکن مغربی استعمار نے اس قسم کے خیالی ظلم کو جو صرف ایک فرد کا تھا، ایک پوری ملت پر بالفعل کر کے دکھا دیا۔ اس استعمار نے سب سے پہلے مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کیا۔ پھر جب اس کے برخلاف اُن کی طرف سے بالکل "مظلومانہ مدافعت" کی کوشش کی گئی تو اس کے چہرے پر شکن آئے۔ اس نے غضبناک ہو کر ان "خودسروں" کو درسِ عبرت دینے کے لیے اُن پر بم برسائے، زہریلی ہواؤں سے اُن کی بصارت زائل کی گئی اور یہ سب کچھ اقوامِ عالم کے سامنے ہوا۔ تہذیب کے علمبرداروں نے، تمدن و شائستگی کے مدعیوں نے یہ خونیں تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا مگر اُن کے دل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انھوں نے حق و انصاف کا ساتھ دینے کی بجائے اس ظالم استعمار کا ساتھ دیا جس کے خلاف اُن کی زبانیں ہمیشہ احتجاج کرتی ہیں۔ کسی نے مظلوم کی حمایت میں اپنا دستِ مدد آگے نہ بڑھایا۔ کسی دردمند

نے مظلوم کی چارہ گری نہ کی۔ مظلوموں کی دلخراش صدائیں اور بے کسوں کی پُر درد آہیں بھی کسی قوم کے احساسِ شرافت کو جگا نہ سکیں۔ انگریزی استعمار کے سارے ظالمانہ ہتھکنڈے اُس چنگاری کو بجھا نہ سکے جو مصری قوم کے دل میں سلگ رہی تھی۔ مصر کی اس جنگ آزادی میں پوری مصری قوم کا سوائے ایک محدود گروہ کے، جس کا مفاد غیر ملکی آقاؤں سے وابستہ تھا، شریک تھی۔ اسی لیے یہ تحریک کسی وقت بھی دبنے نہ پائی۔ جس طرح دریا میں، جب ایک لہر گزر جاتی ہے تو دوسری فوراً اس کی جگہ لینے کے لیے آپہنچتی ہے۔ اسی طرح وفد پارٹی کا جب ایک جتھہ گرفتار ہوتا تو فوراً دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا اور اس میں کبھی خلا نہ پیدا ہوتا۔ تشدد کا ہر وار لوگوں میں آزادی کی تڑپ کو اور تیز کر دیتا، مگر یورپ اس جدوجہد کو سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ بڑی سادہ دلی سے اسے "اجانب بیزاری" سمجھ رہا تھا۔ اس "ریا کارانہ سادہ لوحی" کا سبق بھی دنیا کو اہلِ مغرب نے ہی سکھایا ہے۔

مصر میں اسد صاحب جس مکان میں رہ رہے تھے، وہ مسجد کے بالکل قریب تھا۔ اس "خانۂ خدا" میں پانچوں وقت خدا کا نام بلند ہوتا۔ اسد صاحب نے اس اذان سے بھی ایک نہایت ہی گہرا تاثر لیا۔ وہ اسی کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "میرے گھر کے بالکل قریب ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس سے ہر روز پانچ مرتبہ اذان کی آواز بلند ہوتی۔ ایک شخص سفید پگڑی باندھے گیلری میں آتا، اپنے ہاتھ کانوں تک اٹھاتا اور زور سے پکارتا "اللہ سب سے بڑا ہے" اور میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں"۔ جب وہ آہستہ آہستہ اس محیط کے چاروں کونوں کی طرف رُخ کرتا تو اس کی آواز سبک سیر ہو کے دوش پر سوار ہو کر بلند ہو جاتی۔ اس آواز میں نرم و گرم الفاظ سموئے ہوئے تھے اس میں جو کچھ حسن اور جاذبیت تھی وہ کسی فن کی وجہ سے نہ تھی بلکہ اُس جذبہ کی وجہ سے تھی جو پکارنے والے کے دل میں موجزن تھا۔

اس موذن کی صدا ہر روز ایک ہی تھی اور میں جن جن مسلم ممالک میں گھوما پھرا، ان میں بھی اسے طرزِ ادا کے اختلاف کے باوجود ایک ہی پایا۔ آواز کی اس یک جہتی سے مجھے اس امر کا گہرا احساس ہوا کہ

مسلمانوں کی اندرونی وحدت کتنی گہری اور پائیدار ہے اور ان کے درمیان اگر اختلافات کے پردے کچھ حائل بھی ہیں تو وہ کتنے باریک اور مصنوعی ہیں۔ اُن کی فکر و نظر کا زاویہ ایک ہے۔ ان کے خیر و شر کا معیار بھی ایک ہے، اور اس وجہ سے ایک اچھی زندگی کے بارے میں اُن کے احساسات بھی ایک ہیں"۔

"میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ایسی قوم کو دیکھا جس کے ایک فرد کا دوسرے فرد سے رشتہ نسلی اور معاشی ایسی اتفاقی اور کمزور بنیادوں پر قائم نہ تھا بلکہ ایک ایسی بنیاد پر استوار تھا جو بہت زیادہ مضبوط ہے یعنی طرز فکر کی ہم آہنگی۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان اور انسان کے درمیان اجنبیت کے سارے حجابات کو اٹھا دیتی ہے"۔

اسی طرح فاضل مصنف نے جمعہ کے دن پر بحث کرتے ہوئے بھی بعض نہایت اہم باتیں کہی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"جمعہ کے دن — جو مسلمانوں کا سبت ہے — تم دمشق کی روزمرہ کی زندگی میں ایک تبدیلی محسوس کرو گے۔ اس تبدیلی میں ایک قسم کا ولولہ اور سنجیدگی ہے۔ اس دن سے مجھے اتوار کا دن یاد آتا ہے جب یورپ میں دوکانیں بند ہوتی ہیں اور گلیاں بے رونق۔ یہ دن بیکاری میں گزرتا اور مجھے اس سے وحشت ہوتی۔ میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ اب مجھے اس کی علت معلوم ہوئی۔ اہل یورپ کے لیے ہفتہ کا ہر دن اُن کے لیے ایک بے جا بوجھ کا دن ہوتا ہے جس سے صرف اتوار ہی انہیں نجات دلاتا ہے۔ یہ دن اُن کے لیے آرام اور سکون کا دن نہیں بلکہ ایک ایسا دن ہے جس میں وہ زندگی سے فرار اختیار کر کے ایک قسم کی فریب کارانہ "خود فراموشی" میں پناہ لیتے ہیں۔

عربوں کے لیے جمعہ اپنے کام کے ایام کو بھول جانے کا دن نہ تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی کے پھل ان لوگوں کی جھولی میں بغیر کسی جدوجہد کے خود بخود گرتے تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی محنت، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ ہو، ان کے ذاتی احساسات کے درمیان کوئی مغائرت

نہیں ہے۔ ان کے ہاں کام، کام کی غرض سے نہیں کیا جاتا اس لیے مزدور اور اس کے کام کے درمیان ایک گہرا رابطہ ہے۔ یہاں ایک انسان صرف اُسی وقت آرام کرتا ہے جب وہ تھک جاتا ہے۔ اسلام نے اسی لیے جمعہ کو لازمی تعطیل کا دن قرار نہیں دیا۔ مزدور اور دوکاندار دمشق کے بازاروں میں چند گھنٹے کام کرتے اور پھر کچھ وقت اپنے کام اور دوکانوں کو چھوڑ کر مسجد میں نماز جمعہ کے لیے چلے جاتے اور اس کے بعد اپنے دوستوں کو کسی کیفے میں مل لیتے۔ پھر وہ اپنے کام کاج پر واپس آجاتے۔ صرف چند دوکانیں بند ہوتیں اور وہ بھی اُس وقت جب لوگ مساجد میں نماز کے لیے جمع ہوتے۔ اس کے علاوہ بازاروں میں تمام دن رونق اور گہما گہمی رہتی۔

جمعہ کے روز میرا میزبان مجھے اموی مسجد میں لے گیا۔ ۔ ۔ ۔ اس کی فضا عطر بیز تھی۔ سرخ اور نیلی دریاں فرش پر بچھی ہوئی تھیں۔ ہزاروں آدمی بہت لمبی لمبی قطاروں میں امام کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ سپاہیوں کی طرح ایک نظم کے تحت امام کی پیروی میں رکوع و سجود کرتے۔ وہاں بڑی خاموشی تھی۔ جب وہ لوگ قیام کی حالت میں تھے تو بوڑھے امام کی آواز دُور سے سنائی دیتی جو قرآن پاک تلاوت کر رہا تھا۔ جب امام سجدے میں جاتا تو سارے مقتدی بھی خدا کے حضور میں اس طرح سربسجود ہو جاتے جیسا کہ وہ ذات بالکل اُن کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

" اُس وقت مجھے اس بات کا صحیح طور پر احساس ہوا کہ ان لوگوں کا مذہب اور ان کا خدا ان سے کس قدر قریب ہے۔ اُن کی عبادت، اُن کے معمولات سے کوئی الگ تھلگ اور بے تعلق چیز نہ تھی۔ بلکہ وہ انھیں کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ زندگی اور اس کے معاملات کو بھول جائیں بلکہ اس کی غرض یہ تھی کہ یادِ الٰہی کے ذریعہ سے وہ زیادہ بہتر طریقے پر زندگی کی طرف توجہ کریں۔ جب میں اور میرا دوست مسجد کو چھوڑ رہے تھے تو میں نے اُس سے کہا کہ تم لوگ خدا کو اپنے آپ سے کتنا قریب سمجھتے ہو۔ کاش میں بھی اُسے اسی طرح سمجھتا۔ اس نے کہا: میرے بھائی اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کیا ہمارا خدا ہم سے ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب نہیں ہے۔"

یہ تاثرات جو بالکل ابتدائی تھے، اور جن نے پیدا کرنے میں زیادہ تر دخل جذبات کو تھا، اسد صاحب کو اسلام کے بہت قریب لے آئے۔ انھوں نے دین حق کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ وہ اگرچہ عربی زبان بول لیا کرتے تھے لیکن ابھی تک انھوں نے اس پر اتنی قدرت حاصل نہ کی تھی کہ وہ قرآن پاک اور احادیث نبوی کو براہِ راست سمجھ سکیں۔ چنانچہ اس معاملہ میں تراجم پر انحصار کیا گیا۔ یہ تراجم بلاشبہ ناقص تھے، اور پیغام الٰہی کی صحیح طور پر ترجمانی نہ کر سکتے تھے لیکن ایک سلیم الطبع شخص کی، جو حق کا پوری دیانت داری سے طالب تھا، اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور انھیں کی مدد سے اس نے راہ راست پالی۔ اس کا اظہار انھوں نے مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا ہے :۔

"میرا یہ مطالعہ خواہ کتنا ہی سرسری اور منتشر تھا لیکن اس سے ایک طرح کا حجاب دور ہوا میں اب ایسے خیالات سے آشنا ہوا جن سے میں اب تک بالکل ناواقف تھا۔ اسلام میری نظر میں عام اصطلاح کے مطابق مذہب نہ تھا بلکہ یہ ایک دین تھا۔ ایک طرز زندگی، ایک اسلوب حیات۔ یہ ایک دینیات کا مجموعہ نہ تھا بلکہ انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا ایک ایسا ہمہ گیر پروگرام تھا جس کی بنیاد "شعور حق یا شعور ذات باری" پر رکھی گئی تھی۔ قرآن میں کفارہ کے مسیحی عقیدہ کی طرف کہیں خفیف سے خفیف اشارہ بھی نہ تھا۔ نہ ہی اُس میں اس بات کا تذکرہ تھا کہ انسان اور اس کی قسمت کے درمیان پیدائشی گناہ حائل ہے۔ قرآن پاک میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"۔ یہاں تقویٰ اور پرہیز گاری حاصل کرنے کے لیے کسی قسم کی رہبانیت اختیار نہیں کرنی پڑتی۔ پاکبازی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ گناہ کی حالت اُس کی فطری حالت نہیں بلکہ یہ درحقیقت انسان کی اُن پیدائشی خصوصیات سے بغاوت ہے جو خداوند تعالیٰ نے اُس میں اول روز ہی سے ودیعت کر رکھی ہیں۔ یہاں انسانی فطرت کے بارے میں کسی قسم کی دوعملی نہیں، جسم اور روح دونوں سے ایک ہی طرح بحث کی گئی ہے۔

مجھے پہلے پہل قرآن کے اس طرز فکر نے بڑا مضطرب کیا کہ اس میں نہ صرف روحانی امور پر بحث کی گئی ہے بلکہ دنیا کے معمولی معاملات پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھ پر یہ

حقیقت واضح ہوگئی کہ جب ایک انسان جسم اور روح کا حسین امتزاج ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس دینِ کامل میں انسانی زندگی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہ کیا گیا ہو۔ قرآن حکیم نے اپنے پیروؤں سے اس چیز کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس بات کو کبھی بھی فراموش نہ کریں کہ یہ مادی زندگی ایک ارفع اور اعلیٰ زندگی کے لیے ایک ضروری منزل ہے اور انسان کا حقیقی مقصد یا غایت الغایات روحانی ہی ہے۔ مادی خوشحالی اگرچہ کوئی بری چیز نہیں لیکن یہ مقصود بالذات نہیں۔ اس بنا پر انسانی خواہشات کو اخلاق کے تابع ہونا چاہیے۔ اس اخلاق کا مقصد صرف یہی نہیں کہ خدا اور بندے کے تعلق کو استوار کرے، بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ انسان اور انسان کے تعلق میں بھی انسان کی رہنمائی کرے۔ وہ نہ صرف ایک فرد کی روحانی ترقی کا ضامن ہو بلکہ وہ ایک ایسا ماحول پیدا کرے جو انسانوں کے روحانی ارتقا کے لیے مدد و معاون ثابت ہو تاکہ پوری انسانی زندگی بہتر اور شادکام بن سکے۔"

اسلام کے دوسرے معجزات کی طرح ایک بڑا معجزہ یہ بھی ہے کہ اس نے جسم اور روح کی دوئی کو مٹا کر اسے ایک حقیقت بنا دیا ہے۔ اسی سے دین اور دنیا کی تفریق مٹی ہے اور حیاتِ انسانی کے مختلف شعبوں کے درمیان بُعد ختم ہوا ہے۔ اگر ہم عیسائیوں کی طرح روح اور مادہ کی ثنویت کو مان لیں اور اسے مختلف اجزا میں بانٹ لیں تو اسی سے زندگی کی اصل حقیقت بھی مسخ ہو جائے گی۔ ہم اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اگر نیت کا روحانی سرچشمہ گدلا ہو جائے تو اعمال کے اندر خلوص ختم ہو جائے گا اور یہ مادی زندگی بذات خود منتہائے مقصود بن جائے گی۔ سیاست و اخلاق، معیشت و روحانیت کی اسی تفریق کے باعث جدید تمدن اپنی روحانی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے اور اس کے جو تلخ نتائج برآمد ہوئے ہیں، وہ ہمارے سامنے ہیں ؎

دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

عرب ممالک کی سیر و سیاحت کے بعد اسد صاحب واپس جرمنی تشریف لے گئے۔ وہاں انھیں ایک مشہور اخبار (FRAN KFUIREIER) کے ادارۂ تحریر میں شامل کر لیا گیا۔ یہ ایک اتنا بڑا اعزاز تھا جس کی اسد صاحب کی عمر کا آدمی کبھی توقع نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس پرچہ کے صفحات میں مشرقی ممالک سے متعلق نہایت ہمدردانہ خیالات کا اظہار شروع کیا۔ شام کے وقت انھیں جب

کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گفتگو کا اتفاق ہوتا تو وہ اُن کے سامنے عربوں کی خود اعتمادی کا تذکرہ ضرور کرتے۔ انھیں آہستہ آہستہ اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ یورپ کی اندرونی وحدت جو پارہ پارہ ہو رہی ہے، ان کا اخلاق جس سرعت سے بگڑ رہا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کی تہذیب کا مذہب سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ اس وقت کی سوسائٹی کا نقشہ انھوں نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :

"یہاں میں نے ایک ایسا سماج دیکھا جو خدا کو اپنے ہاں سے خارج کر دینے کے بعد پھر سے اُس کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے بہت تھوڑے لوگ ایسے تھے جو اس اضطراب و بے چینی کی علت جانتے تھے۔ اُن کی اکثریت شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی نہج پر سوچ رہی تھی " چونکہ ہماری عقل ہماری سائنس کے تجربات، ہمارے اعداد و شمار، ہمیں زندگی، اُس کے آغاز اور انتہا کے متعلق کوئی حتمی اور یقینی چیز بتانے سے قاصر ہیں، اس لیے ہمیں اپنی ساری توجہ مادی اور عقلی ترقی پر صرف کرنی چاہیے اور اپنا وقت اس قسم کے اخلاقی اصول اپنانے میں ضائع نہ کرنا چاہیے جو مافوق الطبعی بنیادوں پر قائم ہوں اور جن کا کوئی سائنٹفک ثبوت ہم مہیا کرنے سے قاصر ہوں "

مغربی سوسائٹی نے اگرچہ خدا سے واضح طور پر انکار تو نہیں کیا لیکن اس کے نظام حیات میں کسی "ان دیکھے" خالق پر ایمان لانے کی گنجائش بھی موجود نہیں ہے "

اس کے بعد اسد صاحب نے عیسائیت کے تصورِ دین و دنیا کی ثنویت" پر بحث کی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے فرمایا ہے :۔

"زندگی کے آغاز میں جب میں اپنے آبا و اجداد کے مذہب (یہودیت) سے کسی حد تک مایوس ہو چکا تھا تو میرا مسیحیت کی طرف میلان ہوا۔ میرے خیال میں عیسائیت کا تصورِ خدا عہد نامہ عتیق سے کہیں بہتر تھا کیونکہ اس میں خداوند تعالیٰ صرف ایک گروہ کا خدا نہ تھا بلکہ ساری نوعِ انسانی کا باپ تھا۔ لیکن عیسائیت کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس نے اس کی ہمہ گیری کو سخت مجروح کیا ہے اور وہ ہے جسم و روح کی دوئی یا مذہب و سیاست کی تفریق "

"چونکہ عیسائیت نے شروع ہی سے اپنے آپ کو دنیا اور اس کے سارے معاملات سے

الگ کر دیا تھا اس لیے وہ اس قابل نہ تھی کہ مغربی تہذیب کو وہ کوئی اخلاقی تہذیب بنا سکتی۔ اس کے پیروؤں کے ذہن میں یہ خیال بالکل راسخ ہو چکا تھا کہ مذہب کو انسان کی عملی زندگی سے کوئی ترکا نہ ہونا چاہیے۔ اُن کے نزدیک مذہب کا فرض اسی قدر تھا کہ وہ انسانوں کے اندر ایک انفرادی اخلاق پیدا کر دیں اور وہ بھی صرف شہوت انی پابندی کی حد تک۔ ان کے اس طرز فکر کو کلیسا کے پرانے طرز عمل سے غذا ملی جس نے خدا اور قیصر کے حصوں کو الگ الگ کر کے، صرف خدا کے متعلق بحث کی تھی اور سیاست اور معیشت کو قیصر کا حصہ سمجھتے ہوئے اس سے اپنے آپ کو بالکل بے تعلق کر رکھا تھا۔ چونکہ عیسائیت نے اپنے ماننے والوں کو "امور دنیا" کے بارے میں کوئی راہنمائی نہ دی اس لیے عیسائیت اپنے اس اصل مشن میں ناکام رہی۔ میرے نزدیک اس کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف لوگوں میں نیکی کا شعور پیدا کرے بلکہ انھیں نیکی پر چلنے کا راستہ بھی بتائے۔ یورپ کے رہنے والوں میں اب چونکہ یہ عام احساس پیدا ہو رہا ہے کہ اُن کا مذہب اُن کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا، اس لیے عیسائیت پر سے اُن کا اعتماد قریب قریب اٹھ گیا ہے۔ اور اس کے ختم ہونے کے ساتھ اُن کا اس چیز پر بھی ایمان نہیں رہا کہ یہ کائنات کسی بہت بڑے مدبر کی تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ایمان وایقان کے اس زیاں کی وجہ سے وہ اب ایک قسم کے مکمل اخلاقی و روحانی خلا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"ہماری دنیا شورشوں اور بغاوتوں کی دنیا ہے۔ خونریزی، تباہی اور زبردست آزاری جن کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی وہ ہماری تہذیب کے نوامیس عالیہ ہیں۔ روایات کے بندھن اب ٹوٹ رہے ہیں، مقاصدِ حیات ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں، زندگی کے لیے نئے نئے راستوں کی بڑی سرگرمی سے تلاش ہو رہی ہے۔ عالم گیر جنگ کے بطن سے بہت سی چھوٹی چھوٹی جنگوں نے جنم لیا، بہت سے انقلابات نے سر اٹھایا، بہت سی معاشی تباہ کاریاں دیکھنے میں آئیں ــــ یہ سب ناکامیاں اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ مغرب کا مادی اور صنعتی ترقی پر بے جا اعتماد اس انتشار اور راناری کی کیفیت کو نظم میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ میرے بچپن کے اس احساس کو

کہ ایک انسان کو زندگی گزارنے کے لیے صرف روٹی ہی درکار نہیں، تقویت حاصل ہوئی اور مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ موجودہ دور میں "ترقی" کی جو پرستش کی جارہی ہے وہ دراصل معروضی اقدار پر ایمان کا ایک نہایت ہی غلط طریقہ ہے، جیسے بیوقوفی سے اس کا نعم البدل سمجھا جارہا ہے۔ یہ لوگ ابھی تک اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ انسان آہستہ آہستہ اپنی مشکلات پر قابو پا لینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ صرف معاشی نظام کس طرح ہماری سماجی برائیوں کو درست کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ عوارض کی چند ظاہری علامتوں کو تو دور کر دیں، لیکن ان کے حقیقی اسباب کو مٹانا ان کے بس سے باہر ہے۔"

اسد صاحب نے ترکوں کا نفسیاتی جائزہ بھی بڑی عمدگی سے لیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی حرکات و سکنات میں ایک قسم کا تکلف اور تصنع ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے لکھا ہے:

"یہ لوگ حسین وجمیل ہونے کے باوجود بڑے بدصورت ہیں اور ان کی حرکات تیز مگر بڑی بھونڈی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسا کہ ان کے مقصد اور احساس کے درمیان کوئی تعلق باقی نہیں رہا اور میں جانتا ہوں کہ اگرچہ وہ اپنے آپ کو ایک بامقصد قوم ظاہر کر رہے ہیں لیکن یہ ان کی خود فریبی ہے۔"

فاضل مصنف کا یہ تجزیہ بڑا ہی صحیح اور درست ہے۔ جب ایک قوم غیروں کی نقالی میں اپنی کامیابی سمجھنے لگتی ہے تو اس کے اندر تخلیق کی ساری قوتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ قوم خود اپنے ہاتھ سے قائدانہ صلاحیتوں کو تباہ کرتی ہے اور بڑی خوشی کے ساتھ دنیا میں دوسروں کی خیمہ بردار کی حیثیت سے جینا سیکھتی ہے۔ ترک قوم کا حال اس نادان بچے کا سا ہے جو اپنے ہاتھ سے اپنے مکان کو آگ لگا کر تماشا دیکھنے میں گوناگوں لذت محسوس کرتا ہے۔

کتاب کے اس حصے میں جناب اسد صاحب نے اس فکر انگیز بحث کو بھی اٹھایا ہے کہ کیا خدا کا تصور بھی جغرافیائی ماحول کی کرشمہ سازی ہے۔ یورپ کے بعض بڑے بڑے فلاسفر نے یہ گمراہ کن نظریہ پیش کیا ہے کہ توحید کا نعرہ صرف صحرا کی پہنائیوں ہی میں بلند ہوا۔ اسد صاحب نے اگرچہ ایک

لطیف انداز میں اس کی تردید کی ہے، لیکن یہ مسئلہ ان کی توجہ کا زیادہ محتاج ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ صحرا کی وسعتوں نے انسان کے اندر ایک خدا کے تصور کو پیدا کیا تو ہمیں لازمی طور پر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تصور بھی ہمارے مادی ماحول کی پیداوار ہے۔ معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی ساری عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔ اس کو تسلیم کر لینے سے پھر ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سارے مذاہب صحیح اور درست ہیں کیونکہ سب کو اُن کے جغرافیائی حالات نے جنم دیا ہے۔ اس سے حق اور باطل کی تفریق بالکل مٹ جاتی ہے اور مارکسی تعلیمات کو درست ماننا پڑتا ہے۔

بالفرض اگر یہ کہا جائے کہ صحرا کی وسعتوں اور پہنائیوں نے انسان کو ایک خدا کا احساس بخشا تو یہ بھی غلط ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صحرا میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لوگ ایسے بھی آباد ہیں جو اَن گنت خداؤں کی پرستش کرتے ہیں اور ان میں جب ایک انسان توحید کا نعرہ بلند کرتا ہے تو یہ سارے اُس کے دشمن بن جاتے ہیں حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ ماحول کی وجہ سے وہ سارے کے سارے موحد ہوتے اور جب کوئی شخص شرک کی دعوت دیتا تو وہ اس کے خلاف صف آرا ہو جاتے۔ کیونکہ ایسے ماحول میں توحید اُن کی فطرت سے اقرب تھی اور شرک اس سے کوسوں دُور، لیکن تاریخ ان لوگوں کے اس نظریہ کی تردید کرتی ہے۔

پھر جب ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ الٰہیات ہمارے ماحول کی پیداوار ہیں تو ہم قدرتی طور پر یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ خارجی ماحول نے ہمارے اندر بعض ایسی داخلی کیفیات پیدا کیں جنھوں نے ایک انسان کے قلب و دماغ میں اس قسم کے احساسات پیدا کیے۔ اس نظریہ پر دو بڑے اعتراضات ہوتے ہیں۔

اگر اس قسم کی کیفیات کی صورت گری صرف جغرافیائی ماحول ہی کرتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ یہ صرف حضرت موسیٰؑ، عیسیٰؑ، ابراہیمؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو پیدا ہو جاتی ہیں لیکن فرعون، نمرود اور ابوجہل میں پیدا نہیں ہوتیں، حالانکہ ان سب کا جغرافیائی ماحول ایک تھا۔

اس سلسلہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انسان کی اندرونی کیفیات اور احساسات کی نوعیتیں اتنی

پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ اُن کے بارے میں وثوق اور یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تاثراتِ قلب خواہ کتنے ہی شدید ہوں، اتنے واضح اور قطعی نہیں ہوتے کہ ان کو کفر و ایمان کا مدار بنایا جا سکے۔

دراصل ہمارے ہاں صدیوں سے یہ غلط تصور چلا آ رہا ہے کہ الہام کشف ہی کی کوئی ترقی یافتہ شکل ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ عقلی تجربات، مراقبہ و تفکر اور وحی و الہام تین الگ الگ انواع ہیں اور ان تینوں کے میدان بالکل جدا جدا ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے پاس ایک ایسی باطنی طاقت اور اندرونی حاسہ ہے جس کو اگر وہ بیدار کرے اور ترقی دے تو مادیات سے ماوراء بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے جن کا ادراک کسی حاسۂ ظاہری سے ممکن نہیں لیکن یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک انسان کے ظاہری حواس کے ساتھ ایک حاسۂ باطنی بھی ہے اور ممکن ہے کہ دوسرے حاسے بھی ہوں۔ لیکن اس سے یہ اخذ کر لینا کہ یہ حاسہ بالکل صحیح ہے اور اس راستہ سے جو علم انسان کو حاصل ہوتا ہے وہ بالکل درست اور قطعی ہے، ٹھیک نہیں۔ انسان کے دیگر حواس کی طرح یہ بھی ایک حاسہ ہے۔ اسی طرح کمزور اور محدود جس طرح دوسرے، اُسی طرح خطاپذیر اور متاثر ہونے والا جس طرح انسان کی ساری طاقتیں اور انکشافِ علم کے سارے ذرائع۔ اس وجہ سے جو علم ہمیں اس ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس میں صحت اور قطعیت نہیں ہوتی۔ اور اس بنا پر اس پر کفر و ایمان کا انحصار نہیں رکھا جا سکتا۔ اگر ہم اہلِ کشف کے باطنی تجربات کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑا تعارض اور تناقض پایا جاتا ہے جس کی نظیر شاید فلسفہ میں بھی نہ مل سکے۔

جو چیز کفر و ایمان کے لیے ایک کسوٹی کے طور پر انسانیت کو دی گئی ہے وہ نہ تو انسانی عقل کی رہینِ منت ہے اور نہ ہی اندرونی کیفیات کی کرشمہ سازی۔ وہ نہایت واضح طور پر ہر آلائش سے پاک اور منزہ، خارج سے بعض پاکباز انسانوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے۔ اس میں نہ اس شخص کی عقل کو دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے باطنی تجربات کو۔ پھر یہ کسی محنت سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء گزرے ہیں انھوں نے اپنے دعوائے نبوت کو بڑے یقین اور وثوق سے پیش کیا۔ اس کے اقرار کو نجات، اور انکار کو کفر قرار دیا۔ اپنے بارے میں انھوں نے

کبھی کسی شک اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ دعویٰ کرنے سے پہلے ان کے متعلق کبھی کسی کو یہ گمان تک نہ ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی دعویٰ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن جب اللہ نے پیغام نازل فرما دیا تو پھر بڑے وثوق اور یقین سے انھوں نے اپنے دعویٰ کو پیش کیا اور اپنے موقف کو لوگوں سے منوایا۔ اب جو شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ خارجی ماحول انسان کے اندر بعض ایسی داخلی کیفیات پیدا کرتا ہے، جن کے ذریعہ وہ اپنے خالق کی صورت گری کر سکتا ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے، کیونکہ اس قسم کی واردات خواہ کتنی ہی روح پرور اور مسحور کن ہوں، ایک دین کی تخلیق نہیں کر سکتیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک فرد کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں لیکن کسی انقلاب انگیز اور باطل شکن تحریک کو جنم نہیں دے سکتیں کیونکہ ان میں وہ قوت، وہ وثوق اور یقین نہیں ہوتا جو کسی نظامِ حیات کے لیے ضروری ہے۔ اس قسم کے کشف صرف ایک فرد تک محدود رہتے ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی دوسروں کے لیے حجت نہیں بن سکتے۔ جب ایک چیز کو حجت، برہان یا الفرقان کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہایت واضح اور غیر مبہم ہو۔

کتاب کے اس حصے میں دو تین مقامات ایسے آتے ہیں جو اگر نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ فاضل مصنف نے جہاں جہاں عورتوں کی تصویر کشی کی ہے وہ اُن جیسے سنجیدہ آدمی کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتی۔ انھوں نے الفاظ کے بالکل بے جا اسراف سے اس قسم کی تصاویر کھینچی ہیں جن میں لذتیت صاف طور پر جھلکتی ہے۔